اس وقت کی قدر کرو اور فائدہ اٹھاؤ

(فرمودہ ۱۱- مئی ۱۹۳۹ء)

۱۱- مئی ۱۹۳۹ء آج حضرت خلیفۃ المسیح الثانی نے بعد نماز عصر مسجد اقصیٰ میں صاحبزادہ مرزا ظفر احمد صاحب بی اے- بیرسٹرایٹ لاء ابن حضرت مرزا شریف احمد صاحب کا نکاح سیدہ نصیرہ بیگم بنت جناب مرزا عزیز احمد صاحب ایم- اے خلف حضرت مرزا سلطان احمد صاحب کے ساتھ ایک ہزار روپیہ مہر پر پڑھا- [1]

خطبہ مسنونہ کی تلاوت کے بعد فرمایا :-

اس دنیا کو اللہ تعالیٰ نے ایسے رنگ میں بنایا ہے کہ بسا اوقات انسان یہ خیال کرتا ہے کہ وہ ترقی کر رہا ہے، وہ خیال کرتا ہے کہ اسے عروج حاصل ہو رہا ہے، وہ خیال کرتا ہے کہ وہ قدم بقدم آگے کی طرف بڑھ رہا ہے مگر ابھی زیادہ عرصہ نہیں گزرتا کہ اسے یہ محسوس ہونے لگتا ہے کہ وہ چیز جسے اس نے اپنا عروج سمجھا تھا درحقیقت اس کے زوال کی ابتداء تھی، جسے اس نے اپنی ترقی کی سیڑھی سمجھا تھا وہ اس کے گرنے کی تمہید تھی اور جسے وہ بڑھنا قرار دے رہا تھا درحقیقت وہ پیچھے لوٹنا تھا- اس کا دل اس تصور سے خوشی محسوس کر رہا تھا کہ وہ سیدھا جا رہا ہے وہ ایک ایسی سڑک پر چل رہا ہے جس میں کوئی خم نہیں لیکن جب وہ اس عمر کو پہنچتا ہے جو فکر اور شعور کی عمر کہلاتی ہے اور جس میں انسان غور کرنے کے بعد مختلف نتائج اخذ کرتا ہے تو یک دم اسے محسوس ہوتا ہے کہ وہ آگے کی طرف نہیں بڑھ رہا بلکہ پیچھے کی طرف لوٹ رہا ہے- اس کی جوانی کی عمر کا جو بھی اندازہ ہو اور یہ اندازے مختلف ہوتے ہیں، کسی کی جوانی چالیس

سال چلتی ہے، کسی کی جوانی پچاس سال چلتی ہے، کسی کی جوانی ساٹھ سال چلتی ہے اور کسی کی جوانی ستر سال چلتی ہے بہرحال اس کی جوانی کا جو بھی اندازہ ہو انسان اس عمر تک چلتا چلا جاتا ہے اور اسے یہی محسوس ہوتا ہے کہ وہ جوانی کی سڑک پر چل رہا ہے۔ مگر چلتے چلتے اسے ایک دم ایک دن معلوم ہوتا ہے کہ جسے وہ چلنا سمجھ رہا تھا وہ دراصل واپس لوٹنا تھا۔ سڑک بالکل سیدھی معلوم ہوتی ہے اور اس میں کوئی خم دکھائی نہیں دیتا لیکن حقیقت اس کے برعکس ہوتی ہے اور انسان اس سڑک پر سے گزر کر پھر واپس لوٹ رہا ہوتا ہے مگر خدا تعالیٰ نے انسانی زندگی میں کچھ ایسا جادو بھر دیا ہے کہ واپس لوٹنا معلوم ہی نہیں ہوتا۔ نہ اسے سڑک میں کوئی خم دکھائی دیتا ہے نہ اس کے نفس میں یہ احساس پیدا ہوتا ہے کہ میں ٹیڑھا ہونے لگا ہوں۔ زمانہ کی لکیر بھی سیدھی ہی ہوتی ہے چنانچہ پچاس کے بعد ۵۱ ہی آتا ہے ۴۹ نہیں آتا اور اکاون کے بعد باون ہی آتا ہے اڑتالیس نہیں مگر باون بتا رہا ہوتا ہے کہ وہ دراصل ۴۸ ہے۔ اسی طرح باون کے بعد سینتالیس کبھی نہیں آئے گا آئے گا تو ترپن ۵۳ ہی آئے گا مگر ترپن اپنی ذات میں سینتالیس کا قائمقام ہوگا۔ اسی طرح اسی ۸۰ کے بعد نوے، نوے ۹۰ کے بعد سو اور سو کے بعد ایک سو دس ہی آئے گا یہ نہیں ہوگا کہ اسی کے بعد ستر یا نوے کے بعد اسّی یا سو کے بعد نوے یا ایک سو دس کے بعد سو آجائے۔ مگر حقیقتاً بعض دفعہ سو دو کے برابر ہو جاتا ہے اور بعض دفعہ سو ایک کے برابر ہو جاتا ہے۔ چنانچہ بعض لوگ جو سو برس کی عمر کو پہنچ جاتے ہیں چھوٹے بچے کی طرح ہو جاتے ہیں چارپائی پر ہر وقت پڑے رہتے ہیں اور پوتے پڑپوتے انہیں رضائیوں میں لپیٹ کر ایک جگہ سے اٹھا کر دوسری جگہ لے جاتے ہیں اور ان کے منہ میں دودھ وغیرہ ڈالتے رہتے ہیں۔ اس وقت بظاہر ان کی عمر سو سال کی ہی ہوتی ہے مگر دراصل ان کی عمر ایک یا دو سال کے بچے جتنی ہوتی ہے وہ سیدھے چل رہے ہوتے ہیں اور ہر ایک کو یہی نظر آتا ہے کہ وہ آگے کی طرف بڑھ رہے ہیں مگر دراصل وہ واپس لوٹ رہے ہوتے ہیں۔ غرض خدا تعالیٰ نے یہ ایک عجیب حیرت انگیز سلسلہ جاری کیا ہوا ہے جس کو سمجھنا انسانی عقل سے بالکل بالا ہے۔

آج جس لڑکے کا نکاح پڑھانے کے لئے میں کھڑا ہوا ہوں وہ مجھ سے چھوٹے سے بھی چھوٹے بھائی کا لڑکا ہے اور جس لڑکی کا نکاح ہے وہ بھی بہرحال بڑی نہیں بلکہ اس سے بڑا ایک بھائی تھا جو فوت ہو چکا ہے۔ اس وقت میری آنکھوں کے سامنے وہ زمانہ آگیا ہے جبکہ کبھی ہم خطبہ پڑھنے والے نہ تھے، خطبہ سننے والے نہ تھے بلکہ خطبہ اگر سنتے تو سمجھ بھی نہیں سکتے تھے۔ مجھے یاد

ہے میں سکول کی طرف سے ایک دن آرہا تھا اس گلی میں سے گزر کر جس گلی میں سے گزر کر ہم مسجد میں آتے ہیں میرے سامنے قریباً میرا ہی ہم عمر ایک چھوٹا سا لڑکا گزر رہا تھا میرے ساتھ اس وقت شیخ یعقوب علی صاحب یا غالباً کوئی اور دوست تھے انہوں نے اس وقت اس لڑکے کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا میاں تیرا بھتیجا آگیا ہے۔ اس وقت کی عمر کے لحاظ سے بھتیجے کو نہ معلوم میں نے کیا سمجھا مجھے یاد ہے میں نے یہ الفاظ سنتے ہی ایک چھلانگ لگائی اور دوڑ کر گھر گیا۔ میرے لئے یہ فقرہ اس وقت ایسا ہی شرمناک تھا جیسے کسی کو کہہ دیا جائے کہ غلطی سے تم مجلس میں ننگے آگئے ہو۔ میں بھی یہ فقرہ سنتے ہی دوڑ پڑا انہوں نے کوشش کی کہ مجھے پکڑ کر ہم دونوں کو آپس میں ملا دیں لیکن میں ان سے پکڑا نہیں گیا۔ کچھ دنوں کے بعد شیخ یعقوب علی صاحب عرفانی اور غالباً قاضی امیر حسین صاحب نے کوشش کر کے ہم دونوں کو اکٹھا کر دیا۔ اس وقت تک بوجہ اس اختلاف کے جو حضرت مسیح موعود علیہ السلام اور مرزا سلطان احمد صاحب میں تھا اور بوجہ اس کے کہ حضرت مسیح موعود علیہ الصلوٰۃ والسلام مرزا سلطان احمد صاحب سے ناراض رہتے تھے ہم کبھی اکٹھے نہیں ہوئے تھے۔ گھر اگرچہ ہمارے پاس پاس ہی تھے مگر مرزا سلطان احمد صاحب چونکہ باہر ملازم تھے اور ان کے بچے بھی باہر ان کے ساتھ ہی رہتے تھے اس لئے اپنے بھتیجے کو دیکھنے کا میرے لئے یہ پہلا موقع تھا۔ ان دونوں نے ہم کو اکٹھا کر دیا اور پھر اس کے بعد بھی یہ دونوں ہم کو آپس میں ملاتے رہے۔ اس کے بعد انہوں نے میرے کانوں میں یہ بات ڈالنی شروع کی کہ اپنے ابا سے کہو کہ یہ بچہ بیعت کرنا چاہتا ہے۔ میں نے حضرت مسیح موعود علیہ الصلوٰۃ والسلام سے اس کا ذکر کیا تو حضرت مسیح موعود علیہ السلام نے فرمایا بچے نے کیا بیعت کرنی ہے۔ اس کو کیا پتہ کہ احمدیت کیا ہے اور ہم کس غرض کے لئے مبعوث ہوئے ہیں مگر یہ پھر بھی میرے پیچھے پڑے رہے اور مجھے کہتے رہے کہ جا کر کہو اس نے بیعت کرنی ہے۔ آخر حضرت مسیح موعود علیہ الصلوٰۃ والسلام نے مجھے اجازت دی اور فرمایا اسے جا کر گھر میں لے آؤ چنانچہ میں انہیں اپنے گھر لے گیا۔ جہاں تک مجھے یاد ہے حضرت مسیح موعود علیہ الصلوٰۃ والسلام اس وقت کوئی تصنیف فرما رہے تھے آپ نے اس بچے کو دیکھا اس کے سر پر ہاتھ پھیرا اور کوئی بات کی جو اس وقت مجھے یاد نہیں اور پھر ہم چلے آئے۔ اس کے یہ معنے تھے کہ گویا انہیں ہمارے گھر میں آنے کا پاسپورٹ مل گیا۔ پھر میں بھی بڑا ہوا اور وہ بھی بڑے ہوئے انہوں نے حضرت مسیح موعود علیہ الصلوٰۃ والسلام کی دستی بیعت کر لی۔ پھر خدا کی قدرت وہ علی گڑھ گئے۔ ۱۹۰۷ء میں

ایک سٹرائیک میں شریک ہو گئے حضرت مسیح موعود علیہ الصلوٰۃ والسلام اس پر سخت ناراض ہوئے اور آپ نے بدر اور الحکم میں ان کے اخراج کا اعلان کردیا۔ بعد میں ان کے ابا نے انہیں کہا کہ جاؤ اور معافی مانگو چنانچہ انہوں نے معافی مانگی اور حضرت مسیح موعود علیہ الصلوٰۃ والسلام نے انہیں معاف کردیا۔ یہ تغیرات تھے جو یکے بعد دیگرے ہوتے چلے گئے پھر مجھے وہ دن بھی یاد ہے کہ جہاں آج کل مرزا گل محمد صاحب کی دکانیں ہیں وہاں ایک چبوترہ ہوا کرتا تھا۔ جس پر عام لوگ بیٹھ جایا کرتے تھے۔ مرزا نظام الدین صاحب اور ان کے بھائی بھی وہاں بیٹھ جاتے اور بعض احمدی بھی بعض دفعہ بیٹھ جاتے۔ ہم بچے بھی کبھی وہاں کھیلا کرتے تھے۔ میری عمر اس وقت کوئی سات آٹھ سال کی تھی ہم وہاں کھیل رہے تھے کہ ایک چھوٹی سی لڑکی جو چار پانچ سال کی ہوگی وہاں کھیلتی ہوئی آئی اور کسی نے مجھے کہا کہ یہ لڑکی تمہارے بھتیجے عزیز احمد کی منگیتر ہے (اس وقت تک شاید مرزا عزیز احمد صاحب سے میری ملاقات ابھی نہیں ہوئی تھی) میں نہیں جانتا کہ آج کل کے بچوں میں بھی یہ احساسات ہیں یا نہیں مگر اس وقت مجھے یہ بات بڑی ہی شرمناک معلوم ہوئی میرا دل دھڑکنے لگ گیا۔ مجھے پسینہ آگیا اور میں نے کہا یہ منگیتر ہے۔ اس سے میں سمجھتا ہوں کہ بچپن میں ہی یہ بات طے ہو چکی ہوگی پھر ہم بڑے ہوئے، ہماری شادیاں ہوئیں اور ہمارے بچے ہوئے۔ پھر وہ بچے پہلے چھوٹے تھے پھر بڑے ہوئے اور اب ان کی شادیوں کا وقت آگیا ہے۔ شاید یہ زمانے ان پر بھی آئے ہوں، شاید یہ لطائف ان سے بھی گزرے ہوں یہ تو وہی جانتے ہیں کہ یہ حالات ان پر گزرے ہیں یا نہیں مگر بہرحال ہم پر گزرے اور اب وہ وقت آگیا کہ ہمارے بچے خود شادیوں کے قابل ہو گئے ہیں اور وہی ذمہ داریاں جو ہم پر پڑیں ان پر بھی عائد ہونے والی ہیں۔ اللہ بہتر جانتا ہے کہ وہ ان ذمہ داریوں کو کس طرح ادا کریں گے مگر بہرحال شادیوں کی خوشیاں اپنے اندر ایسا رنگ رکھتی ہیں جو ہر قوم میں خوشی کے جذبات پیدا کردیا کرتی ہیں۔ مگر بعض خوشیاں ایسی ہوتی ہیں جو اپنے اندر غم کے جذبات بھی رکھتی ہیں اور انسان محسوس نہیں کرسکتا۔ فرق نہیں کرسکتا کہ غم کہاں سے شروع ہوتا ہے اور خوشی کہاں ختم ہوتی ہے۔ اگر ایک طرف دیکھا جائے تو وہ کہتا ہے کہ میں بڑا خوش ہوں اور دوسری نگاہ سے اسے دیکھا جائے تو وہ سمجھتا ہے کہ میں بڑا غمگین ہوں۔ وہ کچھ ایسا اجتماع ضدین ہوتا ہے کہ اس کی مثال دنیا میں بہت ہی کم چیزوں میں پائی جاتی ہے۔ سفیدی اور سیاہی ایک جگہ جمع نہیں ہوتے، نور اور تاریکی ایک جگہ جمع نہیں ہوتے، لیکن خوشی اور غم کا

اجتماع بعض دفعہ ایسا عجیب ہوتا ہے کہ اسے دیکھ کر انسان حیران اور دنگ رہ جاتا ہے۔ ایک ہی وقت میں انسان بہت خوش ہوتا ہے اور اسی وقت انسان بہت ہی غمگین ہوتا ہے۔ مثلاً وہی شادیاں جو ان دنوں ہمارے خاندان میں ہوئیں ایسی ہی ہیں۔ میری بچی کی شادی بھی ایسی ہی تھی۔ آج جس بچی کی شادی ہے وہ بھی ایسی ہی ہے یعنی ان بچیوں کی مائیں ان کے بچپن میں ہی فوت ہوگئیں۔ نصیرہ بیگم جس کی آج شادی ہے اس کی والدہ بھی بچپن میں فوت ہوگئی تھیں جس کا میں نے ابھی ذکر کیا ہے کہ وہ کھیلتے ہوئے میرے پاس آئی اور کسی نے مجھے کہا کہ یہ تمہارے بھتیجے کی منگیتر ہے اور امتہ القیوم جو میری لڑکی ہے اس کی والدہ بھی فوت ہو چکی ہے سو ایسے خوشی کے اوقات میں قدرتی طور پر انسانی ذہن ان حالات کی طرف بھی چلا جاتا ہے اور یہ ایک عجیب قسم کے مخلوط جذبات ہو جاتے ہیں۔ کبھی انسان اپنے ذہن میں ان باتوں کو لاتا ہے کہ اگر لڑکی کی والدہ زندہ ہوتی تو وہ کیسی خوش ہوتی اور کبھی انسانی ذہن اس طرف جاتا ہے کہ اس بچی کے دل میں کیا خیال آتا ہوگا کہ اگر میری والدہ ہوتیں تو وہ آج کیسی خوش ہوتیں اور کبھی انسان کے دل میں یہ خیال آتا ہے کہ انسانی فطرت کو سب سے زیادہ صدمہ پہنچانے والی جو بات تھی وہ اس بچی کو پہنچی کیونکہ لڑکی کے لئے ماں کی وفات سے زیادہ صدمہ والی بات اور کوئی نہیں ہوسکتی۔ انسانی واہمہ خیال کرتا ہے کہ وہ ایک ہی زمانہ جو حقیقی آرام کا زمانہ ہے یعنی بچپن کا زمانہ جس میں انسان غم کو غم اور فکر کو فکر نہیں سمجھتا۔ وہ زمانہ جو خدا نے باقی ساری دنیا کے لئے آرام کا زمانہ بنایا ہے وہ خدا کی کسی عظیم الشان مصلحت کے ماتحت اس بچی کے لئے غم کا زمانہ بن گیا۔ پس دل ڈرتا اور انسانی قلب میں یہ واہمہ پیدا ہوتا ہے کہ کہیں اس بچی کا مستقبل بھی غمگین نہ ہو۔ غرض عجیب قسم کے جذبات مخلوط ہوتے ہیں۔ ایک طرف شادی ہوتی ہے اور ایک طرف انسانی واہمہ قسم قسم کی باتیں کرکے اس کے سامنے لاتا ہے۔ کسی اور کا کیا ذکر ہے خود رسول کریم ﷺ کو ہی دیکھ لو کہ آپ نے کیسے تکلیف دہ حالات میں پرورش پائی آپ کے والد آپ کی پیدائش سے ہی پہلے فوت ہو چکے تھے اور آپ کی والدہ آپ کی پیدائش کے کچھ عرصہ بعد وفات پاگئیں اور آپ کامل طور پر یتیمی کی حالت میں آگئے۔ اس کے بعد آپ کچھ عرصہ تک اپنے دادا حضرت عبدالمطلب کے پاس رہے اور جب وہ وفات پاگئے تو اپنے چچا ابوطالب کی کفالت میں آگئے۔ اس میں کوئی شبہ نہیں کہ انہوں نے آپ کے ساتھ بڑی محبت اور پیار کا سلوک کیا اور آپ کے جذبات اور احساسات کا ہر طرح خیال رکھا مگر آپ کی اپنی

کیفیت یہ تھی کہ جب آپ کے چچا کے گھر میں کھانا تقسیم ہوتا تو تاریخیں بتاتی ہیں کہ آپ کبھی بڑھ کر اپنی چچی سے کھانا نہیں مانگا کرتے تھے بلکہ خاموشی سے ایک کونہ میں کھڑے ہو جاتے۔ دوسرے بچے شور مچاتے اور اچھل اچھل کر اپنی والدہ سے چیزیں لیتے مگر آپؐ ایک گوشہ میں خاموشی کے ساتھ کھڑے رہتے۔ ؎۲ گویا سمجھتے میرا اس گھر میں کیا حق ہے اگر یہ لوگ مجھے کچھ کھلاتے پلاتے ہیں تو درحقیقت مجھ پر احسان کرتے ہیں ورنہ میرا حق نہیں کہ میں ان سے کچھ مانگ سکوں۔

غرض آپ نے اپنے بچپن کا زمانہ انتہائی تکلیف دہ حالات میں گزارا اور پھر بڑے ہوئے تو مکہ والوں نے آپ کو اپنے مظالم کا تختہ مشق بنالیا۔ لیکن پھر ایک دن آیا جب کہ وہی جو اپنے آپ کو لاوارث سمجھتا تھا، جو اپنے چچا کے گھر میں بھی اپنا کوئی حق نہیں سمجھتا اور جسے مکہ والوں نے بھی انتہائی دکھ دیا تھا مکہ میں فاتحانہ طور پر داخل ہوا اور اس نے قریش سے مخاطب ہو کر کہا کہ بتاؤ اب تمہارے ساتھ کیا سلوک کیا جائے؟ انہوں نے کہا آپ ہم سے وہی سلوک کریں جو یوسفؑ نے اپنے بھائیوں کے ساتھ کیا تھا تب آپ نے فرمایا لَا تَثْرِيْبَ عَلَيْكُمُ الْيَوْمَ۔ ؎۳ جاؤ آج تم پر کوئی گرفت نہیں میں نے تمہیں معاف کر دیا۔ حالانکہ مکہ والوں نے آپ سے جو سلوک کیا تھا وہ ایسا ظالمانہ تھا کہ آج بھی تاریخ میں ان واقعات کو پڑھ کر بدن کے رونگٹے کھڑے ہو جاتے ہیں۔ لیکن ظاہر ہے کہ لَا تَثْرِيْبَ عَلَيْكُمُ الْيَوْمَ۔ کے معنے یہ نہیں ہوتے کہ وہ مقام حاصل ہو گیا جو ابتدائی زمانہ میں ایمان لانے والوں کو حاصل تھا۔ لَا تَثْرِيْبَ عَلَيْكُمُ الْيَوْمَ۔ کے صرف اتنے معنے تھے کہ رسول کریم ﷺ نے انہیں معاف کر دیا۔ ورنہ جو مقام ابتدائی زمانہ میں ایمان لانے والوں کو حاصل تھا وہ مکہ والوں کو حاصل نہ ہوا۔ مکہ والوں کی تو یہ کیفیت تھی کہ جب رسول کریم ﷺ پر وحی نازل ہوئی کہ جا اور لوگوں کو خدائی عذاب سے ہوشیار کر تو رسول کریم ﷺ نے تمام لوگوں کو جمع کیا اور ان سے فرمایا کہ مجھے خدا نے تمہاری ہدایت کے لئے بھیجا ہے اگر تم خدائی عذاب سے بچنا چاہتے ہو تو میری آواز سنو اور خدائے واحد کے پرستار بن جاؤ۔ اس پر تمام لوگ آپ کو پاگل اور جھوٹا کہتے ہوئے منتشر ہو گئے ؎۴ اور انہوں نے آپؐ کی بات کی طرف کوئی توجہ نہ کی۔ اس کے مقابلہ میں حضرت ابوبکرؓ کی یہ حالت تھی کہ جب رسول کریم ﷺ نے دعویٰ نبوت کیا تو اس وقت وہ تجارت پر باہر کسی گاؤں میں گئے ہوئے تھے۔ جب آپ مکہ میں واپس آئے اور دوپہر کے وقت سانس

لینے کے لئے تھوڑی دیر کے لئے گھر میں لیٹے تو ایک لونڈی دوڑی ہوئی آپ کے پاس آئی اور کہنے لگی ہائے ہائے تیرا دوست تو آج پاگل ہوگیا ہے۔ حضرت ابو بکرؓ نے کہا کونسا دوست اس نے کہا محمد (ﷺ) اور کونسا۔ حضرت ابو بکرؓ کہنے لگے تمہیں کیونکر پتہ لگا کہ وہ پاگل ہوگیا ہے۔ وہ کہنے لگی آج اس نے قوم کے ندوہ میں اعلان کیا ہے کہ اللہ تعالیٰ کے فرشتے میرے پاس آتے اور مجھ سے باتیں کرتے ہیں۔ حضرت ابو بکرؓ لیٹے ہوئے تھے یہ سنتے ہی آپ اٹھ کھڑے ہوئے اور آپ نے اپنی چادر سنبھالی۔ ہمارے ملک میں جیسے ساڑھیاں ہوتی ہیں اس قسم کی چادر اہل عرب بھی اپنے اردگرد لپیٹ لیا کرتے تھے اور ایک حصہ کا تو تہبند بنا لیتے اور دوسرا اوپر لپیٹ لیتے۔ انہوں نے جلدی سے چادر درست کی جوتی پہن لی اور سیدھے رسول کریم ﷺ کے دروازہ پر پہنچے اور دستک دی۔ رسول کریم ﷺ باہر تشریف لائے تو آپ نے کہا اے میرے دوست! کیا یہ سچ ہے کہ تُو کہتا ہے فرشتے مجھ پر نازل ہوتے اور مجھ سے باتیں کرتے ہیں۔ رسول کریم ﷺ نے اس خیال سے کہ آپ کو ٹھوکر نہ لگے چاہا کہ ابو بکرؓ کو پہلے یہ مسئلہ سمجھالوں اور پھر کوئی اور بات کروں چنانچہ آپ نے فرمایا ابو بکرؓ دیکھو بات یہ ہے۔ حضرت ابو بکرؓ نے کہا میں نے آپ سے ایک سوال کیا ہے آپ کا فرض صرف اتنا ہے کہ میرے سوال کا جواب دیں آپ مجھے کوئی اور بات نہ بتائیں۔ میں نے آپ سے صرف یہ سوال کیا ہے کہ کیا یہ درست ہے کہ فرشتے آپ پر نازل ہوتے اور آپ سے کلام کرتے ہیں۔ رسول کریم ﷺ نے پھر چاہا کہ جواب دینے سے پہلے میں ان کو مسئلہ سمجھالوں تاکہ ٹھوکر نہ لگے چنانچہ آپ نے فرمایا ابو بکر دیکھو بات یہ ہے۔ حضرت ابو بکرؓ نے کہا میں آپ کو خدا کی قسم دے کر کہتا ہوں کہ آپ مجھے ہاں یا نہ میں جواب دے دیں۔ اب رسول کریم ﷺ کے لئے سوائے اس کے کوئی چارہ نہ تھا کہ آپ جواب دے دیتے چنانچہ آپ نے فرمایا ابو بکر پھر بات تو یہی ہے اور اس کے ساتھ ہی آپ کے دل میں اس خیال سے افسردگی پیدا ہوئی کہ ابو بکر میرا پرانا دوست تھا یہ بھی میرے ہاتھ سے گیا۔ مگر جب آپ نے کہا ابو بکر بات تو یہی ہے کہ فرشتے مجھ سے ہم کلام ہوتے ہیں تو حضرت ابو بکرؓ نے کہا آپ گواہ رہیں کہ میں آپ پر ایمان لایا۔ رسول کریم ﷺ نے فرمایا ابو بکر تم مجھے بات تو پوری کر لینے دیتے۔ حضرت ابو بکرؓ نے کہا یا رسول اللہ ﷺ میں نے آپ کو پوری بات اس لئے نہیں کرنے دی کہ جب میں نے ہمیشہ آپ کو صادق اور راست باز پایا ہے تو اب میں اپنے ایمان کو دلیلوں سے کیوں خراب کروں۔ ؎۵

اب یہ کیونکر ممکن تھا کہ ابو بکرؓ اور وہ لوگ برابر ہو جائیں جو فتح مکہ کے وقت رسول کریم ﷺ پر ایمان لائے۔ بے شک رسول کریم ﷺ کا عفو وسیع تھا، بے شک آپ نے انہیں لَا تَثْرِيْبَ عَلَيْكُمُ الْيَوْمَ کہہ دیا مگر لَا تَثْرِيْبَ عَلَيْكُمُ الْيَوْمَ کہنا بالکل اور چیز ہے اور ابو بکرؓ اور عمرؓ اور عثمانؓ اور علیؓ اور ان دوسرے صحابہؓ کا مقام بالکل اور چیز ہے جو ابتدائی زمانہ میں رسول کریم ﷺ پر ایمان لائے۔ ابتدائی زمانہ میں ایمان لانے والوں کے مقام کا اندازہ تم اس سے لگا سکتے ہو کہ ایک دفعہ حضرت ابو بکرؓ اور حضرت عمرؓ کے درمیان کسی بات پر جھگڑا ہو گیا اس دوران میں حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے حضرت ابو بکرؓ پر ہاتھ ڈالا اور ان کا کپڑا پھٹ گیا۔ حضرت عمرؓ کو خیال گزرا کہ اگر رسول کریم ﷺ کو اس واقعہ کی اطلاع پہنچی تو آپ ناراض ہوں گے۔ ادھر کسی شخص نے انہیں خبر دی کہ حضرت ابو بکرؓ کو اس نے رسول کریم ﷺ کی خدمت میں جاتے دیکھا ہے حالانکہ حضرت ابو بکرؓ اس وقت گھر گئے تھے۔ رسول کریم ﷺ کی خدمت میں نہیں گئے تھے۔ یہ دوڑے دوڑے رسول کریم ﷺ کے پاس پہنچے اور کہنے لگے یا رسول اللہ ﷺ آج مجھ سے ایک غلطی ہو گئی ہے میں ابو بکرؓ سے لڑ پڑا ہوں۔ اتنے میں کسی شخص نے حضرت ابو بکر رضی اللہ عنہ کو جا کر خبر دی کہ عمر رسول کریم ﷺ کے پاس پہنچ گئے ہیں اور خبر نہیں وہ بات کو کس رنگ میں بیان کریں۔ حضرت ابو بکرؓ بھی جلدی سے روانہ ہوئے اور رسول کریم ﷺ کی مجلس میں پہنچے۔ جب آپ دروازے میں سے داخل ہوئے تو انہوں نے دیکھا کہ رسول کریم ﷺ کے چہرہ پر شدت غضب کے آثار ہیں اور آپ حضرت عمرؓ کو مخاطب کر کے کہہ رہے ہیں کہ اے لوگو! کیا تم میرا اور اس شخص کا پیچھا نہیں چھوڑو گے جس نے مجھے اس وقت قبول کیا جب ہر شخص کے دل میں کجی پائی جاتی تھی۔ اور حضرت عمرؓ نہایت رقت اور زاری کی حالت میں کہہ رہے تھے کہ یا رسول اللہ ﷺ میرا قصور تھا۔ اتنے میں حضرت ابو بکر رضی اللہ عنہ آگے بڑھے اور وہ رسول کریم ﷺ کے سامنے دو زانو ہو کر بیٹھ گئے اور کہنے لگے یا رسول اللہ ﷺ عمرؓ کا قصور نہیں قصور میرا ہی تھا۔ [۶]

ان واقعات کو دیکھ کر سوچو کہ یہ کیسے ہو سکتا تھا کہ خدا تعالیٰ ایسے لوگوں کی قربانیوں کو بھلا دیتا۔ پس لَا تَثْرِيْبَ عَلَيْكُمُ الْيَوْمَ نے ظاہر طور پر بے شک انہیں سزا سے بچا لیا اور ان کی گردنیں کٹنے سے بچ گئیں مگر وہ عزت ان کو کیسے حاصل ہو سکتی تھی جو ان لوگوں کو حاصل تھی جو ابتدائی زمانہ میں رسول کریم ﷺ پر ایمان لائے۔ چنانچہ اس واقعہ پر کئی سال گزر گئے

رسول کریم ﷺ وفات پاگئے اور حضرت ابو بکر رضی اللہ عنہ خلیفہ ہوئے، پھر حضرت ابو بکرؓ نے وفات پائی اور حضرت عمرؓ خلیفہ ہوئے، ان کی خلافت پر بھی کئی سال گزر گئے تو ایک حج پر حضرت عمر رضی اللہ عنہ گئے۔ اب وہ زمانہ نہیں تھا جبکہ اونٹ چرانے والے عرب بدوی سمجھے جاتے ہوں بلکہ وہ زمانہ تھا جبکہ قیصرو کسریٰ کے ایلچی ان کے آگے ہاتھ جوڑ کر منتیں کرتے اور کہتے کہ ہمیں معاف کردیا جائے۔ پس آج عرب کے رؤوسا کی کیا حیثیت تھی بڑے بڑے بادشاہ ان کے قدموں میں بیٹھنے پر فخر کرتے تھے اور آج عمرؓ کی حیثیت بھی معمولی نہ تھی بلکہ دنیا کے ایک زبردست بادشاہ کی سی تھی۔ چاروں طرف سے وفد آرہے تھے اور اپنی ضرورتیں آپ کی خدمت میں پیش کررہے تھے۔ مکہ کے وہ بڑے بڑے خاندان جو آخر دم تک رسول کریم ﷺ سے لڑتے رہے اور جنہیں رسول کریم ﷺ نے لَا تَثْرِیْبَ عَلَیْکُمُ الْیَوْمَ کہا تھا وہ بھی آج آئے ہوئے تھے اور حضرت عمر رضی اللہ عنہ سے ملنے کے خواہش مند تھے کیونکہ آج عمرؓ سے ملنا کوئی معمولی بات نہیں تھی بلکہ دنیا کی سب سے بڑی بات سمجھی جاتی تھی۔ چنانچہ وہ عرب کے رؤوسا آئے اور حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے پاس بیٹھ گئے اتنے میں ایک غریب مسلمان جس کے تن پر پورے کپڑے بھی نہ تھے آیا اور اس نے کہا السلام علیکم یا امیر المومنین۔ آپ نے فرمایا وعلیکم السلام۔ پھر آپ نے پاس بیٹھے ہوئے رؤساء سے فرمایا ذرا ان کے لئے جگہ چھوڑ دینا۔ چنانچہ وہ پیچھے ہٹ گئے اور اس صحابی کو آپ نے دائیں طرف بٹھالیا۔ وہ بیٹھے ہی تھے کہ مکہ کا ایک اور غریب صحابی جو کسی زمانہ میں غلام تھا آیا اور اس نے کہا السلام علیکم یا امیرالمومنین! آپ نے فرمایا وعلیکم السلام اور ان رؤساء سے فرمایا ذرا پیچھے ہٹ جاؤ اور ان کے لئے جگہ خالی کردو۔ وہ پیچھے ہٹ گئے اور اس صحابی کو بھی حضرت عمرؓ نے اپنے قریب بٹھالیا۔ اسی طرح صحابیؓ کے بعد صحابیؓ آتا چلا گیا۔ وہی صحابیؓ جن کو مکہ کے رؤوساء سخت تنگ کیا کرتے تھے، ان میں وہ بھی تھے جن کو وہ پتھروں پر گھسیٹا کرتے تھے، ان میں وہ بھی تھے جن کے سروں پر وہ جوتیاں مارا کرتے تھے، ان میں وہ بھی تھے جن کے ناک میں آگ کا دھواں پہنچایا جاتا اور کہا جاتا کہ لَآ اِلٰهَ اِلَّا اللّٰهُ کا انکار کرو گے تو تمہیں چھوڑ دیں گے ورنہ نہیں اور ان میں وہ بھی تھے جن کی آنکھیں انہوں نے نکالی تھیں۔ غرض ایک کے بعد دوسرا اور دوسرے کے بعد تیسرا صحابیؓ آیا اور حضرت عمر رضی اللہ عنہ ان کو اپنے پاس بٹھاتے چلے گئے اور رؤساء سے یہی کہتے چلے گئے کہ ذرا پیچھے ہٹ جاؤ۔ یہاں تک کہ دائیں صف صحابہؓ سے بھر گئی پھر بائیں صف بھرنی شروع ہوئی وہ بھی پُر ہوگئی اور

صرف جوتیوں میں بیٹھنے کی جگہ رہ گئی۔ رؤساء وہاں آکر بیٹھے اور پھر اٹھ کر ڈیوڑھی میں چلے گئے اور انہوں نے ایک دوسرے کی طرف دیکھ کر کہا۔ ہم کون لوگ ہیں؟ انہوں نے کہا مکہ کے رئیس اور یہ کون لوگ ہیں جن کو مجلس میں جگہ دی گئی؟ انہوں نے خود ہی کہا مکہ کے وہ ذلیل ترین لوگ جو ہمارے خدمت گزار ہوا کرتے تھے۔ پھر انہوں نے ایک دوسرے سے کہا کیا تم نے دیکھا کہ آج ہم سے کیا سلوک ہوا ہے۔ ایک ایک کر کے فقیر اور غریب لوگ آگے بٹھائے گئے اور عمرؓ نے ان کو ہم پر ترجیح دی۔ یہاں تک کہ ہم کو جوتیوں میں بیٹھنا پڑا۔ کیا اس سے بڑھ کر ہماری کوئی اور بھی ذلت ہو سکتی ہے۔ ان میں سے ایک جو زیادہ شریف الطبع تھا اور اپنے اندر روحانیت رکھتا تھا اس نے کہا یہ بالکل ٹھیک ہے کہ یہ ذلت ہمارے لئے ناقابل برداشت ہے مگر کیا ہم خود اس ذلت کے ذمہ دار نہیں۔ ہم نے محمد ﷺ کا مقابلہ کیا اور آپ پر ایمان لانے والوں کو دکھ دیا مگر یہ وہ لوگ تھے جو آپ کے ساتھ رہے پس اب ہمارا اور ان کا کیا مقابلہ ہو سکتا ہے۔ وہ لوگ بھی اس بات کو سمجھ گئے اور انہوں نے تسلیم کیا کہ یہ سب کچھ ہماری ہی غلطیوں کا نتیجہ ہے۔ مگر انہوں نے کہا اب اس کا کوئی علاج بھی ہو سکتا ہے اور کیا کوئی ایسی صورت نہیں ہو سکتی جس سے ذلت اور رسوائی کا یہ بدنما داغ ہم سے دور ہو سکے۔ تب وہی جو اُن سب میں سے زیادہ سمجھدار تھا پھر بولا اور اس نے کہا۔ عمرؓ سے ہی اس کا علاج دریافت کرنا چاہئے۔ چنانچہ انہوں نے اجازت مانگی اور وہ آپ کی خدمت میں جاکر بیٹھ گئے اور کہنے لگے آج جو کچھ ہم سے سلوک ہوا ہے ہم اس کے بارہ میں کچھ عرض کرنے آئے ہیں۔ حضرت عمر رضی اللہ عنہ کا خاندان انسابِ عرب یاد رکھنے میں نہایت مشہور تھا اور آپ جانتے تھے کہ یہ لوگ خاندانی لحاظ سے کس عظمت کے مالک ہیں۔ جب انہوں نے یہ بات کہی تو آپ کی آنکھوں میں آنسو ڈبڈبا آئے اور آپ نے فرمایا میں سمجھتا ہوں مگر میں معذور ہوں تم جانتے ہو یہ وہ لوگ ہیں جو رسول کریم ﷺ کے صحابیؓ ہیں اور اس وجہ سے میرا فرض تھا کہ میں ان کو مقدم رکھتا۔ انہوں نے کہا ہم یہ بات سمجھ کر آئے ہیں۔ مگر اب ہم آپ سے یہ پوچھنا چاہتے ہیں کہ کیا اب کوئی ایسی صورت نہیں جس سے یہ بدنما داغ ہم سے دور ہو سکے۔ حضرت عمر رضی اللہ عنہ بڑے رقیق القلب تھے یہ سنتے ہی آپ کی آنکھوں میں آنسو آگئے آپ کی آنکھوں کے سامنے وہ تمام نظارہ آگیا کہ کس طرح یہ لوگ لمبی لمبی تہبندیں باندھ کر بیٹھا کرتے تھے اور لوگ ان کے سامنے یہ کہتے ہوئے اپنے ہاتھ جوڑا کرتے تھے کہ آپ ہمارے بادشاہ اور سردار ہیں۔ اور پھر کس طرح

اس سرداری اور حکومت کے گھمنڈ میں وہ مسلمانوں کو تکلیفیں پہنچایا کرتے تھے۔ یہ تمام نظارے یکے بعد دیگرے آپ کی آنکھوں کے سامنے آگئے اور آپ پر اس قدر رقت طاری ہوئی کہ الفاظ آپ کے منہ سے نہیں نکل سکے آپ نے کوشش کی کہ زبان سے ان کی بات کا جواب دیں مگر رقت کے غلبہ کی وجہ سے آپ جواب نہیں دے سکے۔ صرف آپ نے اپنا ہاتھ اٹھایا اور شمال کی طرف جہاں ان دنوں لڑائی ہو رہی تھی اشارہ کرکے کہا۔ وہاں۔ یعنی اب تمہاری اس ذلت کا صرف ایک ہی علاج ہے اور وہ یہ کہ تم یہاں سے چلے جاؤ اور اس جہاد میں شامل ہو جاؤ جو شام میں کفار سے کیا جا رہا ہے اور وہاں مارے جاؤ۔ چنانچہ وہ خاموشی سے اٹھے اور انہوں نے کہا کہ ہم ممنون ہیں کہ آپ نے ہمیں یہ مشورہ دیا۔ ہم اب اس مشورہ پر عمل کرکے رہیں گے چنانچہ وہ چھ نوجوانوں کا قافلہ وہاں سے نکلا اور چھ کے چھ ہی شام میں مارے گئے ان میں سے ایک بھی مکہ واپس نہیں آیا۔ ےہ

اس واقعہ سے ہمیں ایک عظیم الشان سبق ملتا ہے اور وہ یہ کہ یہی غم کے حالات ہمارے لئے بھی کمال خوشی اور ترقی کا ذریعہ بن سکتے ہیں بشرطیکہ ہم اپنے آپ کو خدا تعالیٰ کے سپرد کردیں اور بشرطیکہ ہم کلیتہً خدا تعالیٰ کے ہو جائیں جس خدا نے ابو طالب کے ایک کونے میں بیٹھے ہوئے بھتیجے کو عظیم الشان ترقی دی اور اسے انتہائی کمال عطا فرمایا اس خدا کے خزانے آج ختم نہیں ہوگئے۔ آج بھی اس کے خزانے بھرے ہوئے ہیں۔ آج بھی وہ اپنے پیاروں کی خاطر اسی قسم کے نظارے دکھانے کی قدرت رکھتا ہے۔ چنانچہ بعینہٖ اسی قسم کا نظارہ خدا تعالیٰ نے مسیح موعود علیہ السلام کے متعلق دکھایا۔ آپ فرماتے ہیں۔ ؎

لَفَاظَاتُ الْمَوَائِدِ كَانَ اُكُلِیْ
وَصِرْتُ الْيَوْمَ مِطْعَامَ الْاَهَالِیْ ۵ہ

کہ کسی دن میرا یہ حال تھا کہ لوگ اپنے دستر خوان سے بچا کھچا اٹھا کر میرے آگے رکھ دیتے اور جو کچھ وہ دیتے میں کھالیا کرتا مجھے ان سے جو کچھ ملتا میں اسے ان کا رحم سمجھتا تھا یہ خیال نہیں کرتا تھا کہ اس چیز پر میرا کوئی حق بھی ہے مگر آج وہ دن ہے کہ گھروں کے گھر اور خاندانوں کے خاندان میرے ذریعہ پل رہے ہیں۔ میں نے بعض بوڑھے لوگوں سے اپنی تائی صاحبہ کے متعلق سنا ہے اللہ تعالیٰ انہیں معاف کرے وہ بعد میں احمدی بھی ہوگئیں اور موصیہ بھی بن گئیں اور اب بہشتی مقبرہ میں دفن ہیں۔ مگر لوگ سنایا کرتے تھے کہ جوانی کے ایام میں

حضرت مسیح موعود علیہ الصلوٰۃ والسلام کے ہاں جب کوئی مہمان آتا اور آپ کو کھانا تیار کرنے کے لئے کہتے تو وہ کہلا بھیجتیں کہ تمہارے مہمانوں کے لئے ہمارے پاس کوئی کھانا نہیں۔ آخر حضرت مسیح موعود علیہ الصلوٰۃ والسلام کسی بہانے مہمان کو اپنا کھانا کھلا دیتے اور خود فاقہ کرتے اور بعض دفعہ جب کوئی کہتا کہ بی بی یہ تو آدھی جائداد کا مالک ہے آپ اس سے ایسا سلوک کیوں کرتی ہیں تو وہ کہتیں "ایہہ سارا دن مسیتے بیٹھا رہندا اے۔ اس دا جائداد نال کی تعلق ہے"۔ یعنی یہ سارا دن مسجد میں بیٹھا رہتا ہے اس کا جائداد سے کیا تعلق ہے؟ یہ ہمارا پنجابی محاورہ ہے اس کا یہ مطلب ہوا کرتا ہے کہ جب فلاں شخص اپنے بھائیوں کا ہاتھ نہیں بٹاتا تو اس کا جائداد سے بھی کوئی تعلق نہیں ہو سکتا۔ اب کجا وہ حالت کہ قادیان ایک کوردہ تھا جس کو دنیا میں کوئی بھی نہیں جانتا تھا اور کجا یہ حالت کہ خدا تعالیٰ نے دین کی تمام ترقیات کا مرکز قادیان کو بنا دیا اور آئندہ اسلام کو جو بھی عظمت حاصل ہوگی اس عظمت کی بنیاد رکھنے والی فوجیں یہیں سے تیار ہو کر نکلیں گی۔ مجھے یاد ہے کہ ہم چھوٹے بچے تھے تو تائی صاحبہ ہمیں دیکھ کر ہمیشہ یہ کہا کرتی تھیں کہ "جیہو جہیا کاں اوہو جہی کوکو" کہ جیسے باپ خراب ہے ویسے ہی اس کے بچے بھی ہیں۔ چونکہ حضرت مسیح موعود علیہ الصلوٰۃ والسلام ان لوگوں کی مخالفت کی وجہ سے الگ رہتے تھے اس لئے وہ آپ کو اچھا نہیں سمجھتی تھیں اور انہیں شکوہ رہتا تھا کہ وہ مجھے آکر سلام نہیں کرتا۔ تو خدا تعالیٰ کے ان زندہ معجزات کو دیکھنے کے بعد کیونکر ممکن ہے کہ لوگ دین کو دنیا پر مقدم کریں اور پھر خدا ان کے لئے بھی اپنے تازہ معجزات اور نشانات نہ دکھائے۔ لوگوں کی بڑی غلطی یہ ہے کہ وہ سمجھتے ہیں اصل عزت وہ ہے جو دنیا کی طرف سے ملتی ہے حالانکہ اصل عزت وہ ہے بلکہ حقیقت عزت وہ ہے جو خدا تعالیٰ کی طرف سے حاصل ہوتی ہے۔ مرزا سلطان احمد صاحب جو میرے بڑے بھائی تھے وہ ڈپٹی کمشنر ہو کر ریٹائر ہوئے تھے اور دنیوی لحاظ سے ان کی اچھی عزت تھی لیکن تم سمجھتے ہو اگر وہ میری بیعت نہ کرتے تو ان کو وہ مقام حاصل ہو سکتا جو آج حاصل ہے؟ آج لاکھوں لوگ ان کا نام ادب سے لیتے اور ان کے لئے دعا کرتے ہیں لیکن اگر وہ میری بیعت نہ کرتے تو لاکھوں لوگ ان کا نام لیتے ہی منہ پھیر لیتے۔ تو دنیا کی افسری اور گورنمنٹ انگریزی کے عہدے کسی کام نہیں آسکتے صرف اطاعت ہی تھی جو ان کے کام آگئی کیونکہ بڑے بھائی کا ایک چھوٹے بھائی کی بیعت کرنا جو اس کے بچوں کے برابر ہو معمولی قربانی نہیں۔ ایک تلخ گھونٹ تھا جو ان کو پینا پڑا مگر اس تلخی نے ان کی ہمیشہ کی زندگی کو سنوار

دیا۔ گزشتہ دنوں جب چیف جسٹس صاحب ۹؎ یہاں آئے تو وہ مجھے باتوں باتوں میں کہنے لگے کہ کیا آپ خیال کرتے ہیں کہ اگر آپ کے والد زندہ ہوتے تو وہ آپ کی بیعت کر لیتے۔ میں نے انہیں کہا کہ میرے والد تو بانی سلسلہ تھے اور میں ان کا دوسرا خلیفہ ہوں۔ پس ان کی بیعت کا تو کوئی سوال ہی پیدا نہیں ہوتا ہاں میں آپ کو یہ بتا سکتا ہوں کہ جب میں خلیفہ ہوا ہوں تو میرے نانا زندہ تھے اور انہوں نے میری بیعت کی۔ اسی طرح والدہ نے میری بیعت کی اور پھر میرے بڑے بھائی نے میری بیعت کی۔ انہوں نے یہ باتیں سن کر بڑی حیرت کا اظہار کیا اور کہا یہ بہت بڑی قربانی ہے۔ تو اللہ تعالیٰ کا ہو جانا یہ بڑی چیز ہے۔ اللہ تعالیٰ نے قادیان کو خصوصاً حضرت مسیح موعود علیہ الصلوٰۃ والسلام کے خاندان کو اس لئے بنایا ہے کہ وہ دین اسلام کی خدمت کریں اور دین کو عزت کے مقام پر پہنچائیں اس لئے نہیں بنایا کہ وہ دنیا کمائیں اور اس میں تمام عمر مشغول رہیں اور یہی وہ شرف اور عزت ہے جس کی وجہ سے حضرت مسیح موعود علیہ السلام کے خاندان کا ایک ادنیٰ سے ادنیٰ فرد اس سے بہت زیادہ عزت رکھتا ہے جتنی عزت دنیا میں کوئی بڑے سے بڑا آدمی رکھتا ہے۔ آج یہ عزت نظر نہیں آتی کیونکہ عزت کرنے والے معمولی لوگ ہیں لیکن جب بادشاہ اس سلسلہ میں داخل ہوئے اور انہوں نے حضرت مسیح موعود علیہ السلام کے خاندان کے افراد کی عزت کی تو اس وقت لوگ محسوس کریں گے کہ اس خاندان کو کتنی بڑی عظمت حاصل ہے۔ یہ نہیں کہ اس وقت عزت زیادہ ہو جائے گی عزت تو اسی قدر ہے جتنی آج ہے مگر چونکہ لوگ یہ کہتے ہیں کہ جب بڑے آدمی عزت کریں تو وہ عزت بڑی ہوتی ہے اور جب چھوٹے آدمی عزت کریں تو وہ عزت معمولی ہوتی ہے اسی لئے جب بادشاہ اور بڑے حکام عزت کریں گے تو اس وقت لوگ کہیں گے کہ اس خاندان کی عزت بہت زیادہ ہو گئی۔ حالانکہ عزت تو آج بھی حاصل ہے مگر چونکہ عزت کرنے والے اکثر معمولی آدمی ہیں اس لئے لوگوں کو عزت کوئی بڑی دکھائی نہیں دیتی۔ بہرحال خدا یہ فیصلہ کر چکا ہے کہ وہ اس خاندان کو ترقی دے۔ چنانچہ جب خدا کہتا ہے کہ "بادشاہ تیرے کپڑوں سے برکت ڈھونڈیں گے" تو اس کا یہی مفہوم ہے کہ کپڑے جو تھوڑی دیر کے لئے ملابست حاصل کر سکتے ہیں جب خدا ان کو برکت دے گا تو وہ لوگ جو حضرت مسیح موعود علیہ الصلوٰۃ والسلام کے خاندان کے افراد ہوں گے ان کو کیوں عزت نہیں دے گا۔

پس حضرت مسیح موعود علیہ السلام کی ذریت کو ہمیشہ دین کی خاطر اپنی زندگیاں بسر کرنی

چاہئیں کیونکہ انہی سے لوگوں نے برکتیں حاصل کرنی ہیں۔ اگر وہ ان برکتوں کے وارث ہو جائیں اور خدا تعالیٰ کے فضلوں کو جذب کرلیں تو ان کے حق میں بہت سے خدائی وعدے موجود ہیں۔ لیکن اگر وہ دین کی خاطر اپنی زندگیاں بسر نہیں کریں گے تو خدا تعالیٰ کو تو کسی کی پرواہ نہیں وہ غنی عن العالمین ہے۔ وہ اپنے روحانی فضل ان سے اٹھالے گا۔ بے شک دنیا اس وقت بھی ان کی عزت کرے گی کیونکہ جو خاندان ایک دفعہ اونچا ہو جائے لوگ ایک لمبے عرصے تک اس کی عزت کرنے پر مجبور رہتے ہیں لیکن خدا کے حضور ان کی کوئی عزت نہیں ہوگی۔ جیسے آج کئی سید ہیں مگر نو مسلموں سے بھی بدتر ہیں لیکن انہیں شاہ صاحب شاہ صاحب ہی کہتے ہیں۔ حالانکہ خدا تعالیٰ کی نگاہ میں ایسے سید کی نسبت اس ادنیٰ انسان کی زیادہ عزت ہوتی ہے جو اسلام کے احکام پر عمل کرتا ہے۔ پس ظاہری عظمت کچھ چیز نہیں اصل عظمت وہی ہے جو روحانی رنگ میں حاصل ہوتی ہے۔ ظاہری عظمت تو اب ہمارے خاندان کی خدا تعالیٰ کے فضل سے چلتی چلی جائے گی کیونکہ جو خاندان بڑے ہو جائیں گے ان کے افراد گو بعد میں روحانی اور اخلاقی لحاظ سے گر بھی جائیں دنیا ان کا ادب کرتی ہے مگر بہرحال اس وقت ان کی حیثیت آثار قدیمہ کی سی ہوتی ہے۔ جس طرح بعض دفعہ پرانی پھٹی ہوئی جوتی کو احتیاط سے اٹھالیا جاتا ہے اور کہا جاتا ہے کہ یہ تیمور کی پھٹی ہوئی جوتی ہے حالانکہ اپنے زمانہ میں اس پھٹی ہوئی جوتی کی کوئی وقعت نہیں ہوتی۔ اسی طرح بڑے خاندان کے افراد اگر بعد میں خراب بھی ہو جائیں تو آثار قدیمہ سمجھتے ہوئے ان کی کچھ عزت کی جاتی ہے لیکن وہ حقیقی عزت نہیں ہوتی۔ حقیقی عزت وہی ہے جس کے ساتھ زندہ خدا کی نصرت شامل ہو اور اگر کسی کے ساتھ زندہ خدا کی نصرت شامل نہیں تو خواہ لوگ اس کو کس قدر عزت کی نگاہ سے دیکھیں وہ مردود اور روحانی لحاظ سے مردہ ہے اور قطعاً زندہ کہلانے کا مستحق نہیں۔ بے شک وہ لوگوں کو زندہ دکھائی دیتا ہے مگر خدا تعالیٰ کی نگاہ میں مردہ ہوتا ہے کیونکہ اس کی روحانی قوتیں مردہ اور بیکار ہوتی ہیں۔ حضرت مسیح موعودؑ نے جب عبداللہ آتھم کے متعلق پیشگوئی کی کہ اگر وہ اسلام کے خلاف بدزبانی سے باز نہ آیا تو پندرہ ماہ کے اندر ہلاک ہو جائے گا اور آتھم نے اس عرصہ میں پیشگوئی کی ہیبت سے متأثر ہو کر اپنے رویہ میں تبدیلی کرلی اور وہ ہلاکت سے بچ گیا تو اس پر مخالفین نے بہت شور مچایا اور کہا کہ مرزا صاحب کی پیشگوئی جھوٹی نکلی۔ اس زمانہ میں جو نواب صاحب بہاول پور تھے اور جن کا نام صبح بہار صادق یا کچھ اور تھا ایک دن ان کی مجلس میں بھی اس

پیشگوئی کا ذکر آگیا اور لوگوں نے کہنا شروع کر دیا کہ مرزا صاحب قادیانی کی پیشگوئی جھوٹی نکلی اور درباریوں نے بہت کچھ ہنسی اور استہزاء سے کام لینا شروع کر دیا۔ ہنسی مذاق ہو ہی رہا تھا کہ نواب صاحب بھی اس میں شامل ہو گئے اور انہوں نے کہا کہ ہاں یونہی لوگ پیشگوئیاں کر دیتے ہیں اور اپنے آپ کو خدا رسیدہ ظاہر کرنے کی کوشش کرتے ہیں مگر جب پیشگوئی پوری نہیں ہوتی تو ان کی قلعی کھل جاتی ہے اور ظاہر ہوتا ہے کہ وہ کسی روحانیت کے مالک نہ تھے۔ نواب صاحب کے پیر چاچڑاں شریف والے بھی اس مجلس میں موجود تھے جب تک لوگ مذاق کرتے رہے وہ خاموشی سے بیٹھے رہے مگر جب نواب صاحب بھی شریک ہو گئے تو چونکہ وہ نواب صاحب کے پیر تھے اور ان کو ڈانٹ ڈپٹ بھی کیا کرتے تھے اس لئے جوش میں آگئے اور انہوں نے نواب صاحب سے مخاطب ہوتے ہوئے کہا تم کو کیا معلوم ہے کہ پیشگوئیاں کیا ہوتی ہیں اور تم ایسی باتوں میں کیوں دخل دیتے ہو۔ تم کہتے ہو کہ آتھم زندہ ہے مجھے تو اس کی لاش اپنے سامنے نظر آرہی ہے۔ ؎ اور حقیقت بھی یہی ہے۔ آتھم اس وقت روحانی لحاظ سے زندہ نہیں تھا بلکہ مر چکا تھا کیونکہ جب اسے کہا گیا کہ تم جو محمد ﷺ کے متعلق کہتے ہو کہ وہ نعوذ باللہ جھوٹے اور دجال تھے اگر تم اپنی اس شرارت سے باز نہ آئے اور رسول کریم ﷺ کے متعلق ایسے کلمات کا استعمال تم نے ترک نہ کیا تو پندرہ ماہ کے اندر تم ہاویہ میں گرائے جاؤ گے تو اس نے پیشگوئی سنتے ہی اپنے کانوں کو ہاتھ لگایا اور کہا میری توبہ میں آئندہ ایسے الفاظ نہیں کہوں گا۔ پس وہ تو مردہ ہو چکا کیونکہ جس مذہب اور جس عقیدہ پر وہ پہلے ایمان رکھتا تھا اس کو اس نے اپنے عمل سے باطل ثابت کر دیا اور گویا وہ پہلا آتھم نہ رہا بلکہ پہلے آتھم پر ایک موت آگئی اور اب ایک نیا آتھم بن گیا۔ یہی بات چاچڑاں شریف والے جو پیر تھے انہوں نے بھی کہی اور فرمایا کہ تم غلط کہتے ہو کہ آتھم زندہ ہے مجھے تو اس کی لاش سامنے نظر آرہی ہے۔ تو بہت سے لوگ بظاہر زندہ نظر آتے ہیں مگر حقیقتاً مردہ ہوتے ہیں اور بہت سے بظاہر معزز دکھائی دیتے ہیں مگر حقیقتاً ذلیل ہوتے ہیں۔ عزت وہی ہے جو خدا تعالیٰ کی طرف سے آتی ہے اور زندگی وہی ہے جس کا جام اس کی طرف سے تقسیم ہوتا ہے۔ حضرت مسیح موعود علیہ السلام کے خاندان اور آپ کے متبعین کے لئے بھی اللہ تعالیٰ نے برکتوں کے دروازے کھول دیئے ہیں بشرطیکہ وہ دنیوی عزتوں کا حصول اپنا منتہیٰ قرار نہ دیں۔ دنیا کمانی منع نہیں مگر دنیا کا ہو رہنا منع ہے۔ اسی طرح روٹی کمانا منع نہیں مگر دین کو دنیا پر مقدم نہ رکھنا اور آٹھوں پہر روٹی کمانے میں

مشغول رہنا منع ہے۔ مومن کا کام صرف اتنا ہے کہ وہ دنیا کے لئے اتنا وقت خرچ کرے جتنے وقت کے بعد اسے روٹی مل جائے اور اس سے زائد وقت جتنا ہو اسے خدا کے دین کے لئے صرف کرے۔ مگر دنیا کی ترقی میں ایک دوسرے کا مقابلہ کرنا یہ چیز ہے جس کو خدا ان لوگوں کے لئے پسند نہیں کرتا جن کے لئے اس نے روحانی اور ضروری عزتیں مقدر کی ہوئی ہوں۔ اور لوگ اگر دنیا کمانے میں اس طرح مشغول ہو جائیں تو وہ ان کو معاف بھی کر دیتا ہے۔ لیکن اگر وہ لوگ اس طرف متوجہ ہوں جن کو اس نے دینی طرف سے عزتیں دینے کا وعدہ کیا ہو تو وہ ان کو کبھی معاف نہیں کرتا۔

غرض میں یہ بتا رہا تھا کہ ہمارے ملک میں بے ماں کے بچوں کی شادیاں بھی رقت پیدا کرنے کا موجب ہو جاتی ہیں اور کئی قسم کے جذبات دل میں اٹھنے لگ جاتے ہیں گویا آج ہماری مثال بالکل وہی ہے جو فتوحات مکیہ میں محی الدین صاحب ابن عربی نے لکھی ہے.... وہ لکھتے ہیں ایک دفعہ میں کہیں جا رہا تھا کہ رستہ میں میں نے ایک درخت پر ایک کوے اور کبوتر کو اکٹھے بیٹھے دیکھا۔ وہ بیٹھے رہے اور بیٹھے رہے اور میں دل میں یہ سوچتا رہا کہ کوے اور کبوتر کا آپس میں کیا جوڑ ہے مگر مجھے کچھ پتہ نہ لگا لیکن میں نے تہیہ کر لیا کہ میں اس کی حکمت معلوم کر کے جاؤں گا۔ چنانچہ میں وہیں بیٹھ گیا اور کافی دیر بیٹھا رہا آخر وہ دونوں ہلے تو مجھے معلوم ہوا کہ دونوں ہی لنگڑے ہیں اور اس وجہ سے وہ ایک جگہ بیٹھے ہیں۔ [1] وہ تو کوے اور کبوتر کا اجتماع بے جوڑ سا نظر آتا تھا مگر یہاں ایک خاندان کے آگے پیچھے دو شادیاں ایسی ہوئی ہیں جن میں دونوں لڑکیاں بے ماں ہیں۔ یعنی میری لڑکی امتہ القیوم کی والدہ بھی فوت ہو چکی ہے اور نصیرہ بیگم کی والدہ بھی عرصہ ہوا فوت ہو چکی ہے۔ ان شادیوں کا تصور کر کے میرا ذہن اس طرف گیا کہ بے شک یہ جذبات کو ابھارنے اور افکار میں ایک انگیخت پیدا کرنے والی چیز ہے مگر اس غم پر غالب آنے کی قوت بھی رسول کریم ﷺ کے نمونہ کو دیکھ کر پیدا ہو سکتی ہے اور وہ اس طرح کہ ہماری بچیاں تو بے ماں کی ہیں مگر محمد ﷺ کی والدہ بھی بچپن میں فوت ہو چکی تھیں اور ان کے والد بھی وفات پا چکے تھے اور اس طرح وہ بے باپ اور بے ماں کے تھے۔ پھر آپ کو پرورش کرنے والے ایسے لوگ نہیں ملے جیسے پرورش کرنے والے ہماری بچیوں کو ملے ہیں۔ گو اپنی نسبت کچھ کہنا معیوب سا دکھائی دیتا ہے مگر میں سمجھتا ہوں کہ میں نے اپنی بچی کا اس حد تک خیال رکھا ہے جس حد تک کوئی باپ اپنی بچی کا خیال رکھ سکتا ہے اسی طرح میں جانتا ہوں کہ

مرزا عزیز احمد صاحب نے بھی اپنی لڑکی کا بہت خیال رکھا ہے مگر محمد رسول اللہ ﷺ کی پرورش کرنے والے ان کے چچا تھے اور چچا کے متعلق بھتیجا یہی سمجھا کرتا ہے کہ اگر وہ مجھے پالتا ہے تو مجھ پر احسان کرتا ہے۔ اپنی ماں اور اپنے باپ پر تو وہ اپنا حق سمجھتا ہے مگر کسی دوسرے سے اسے چیز مانگتے ہوئے حجاب آتا ہے اور وہ خیال کرتا ہے کہ میں اس سے کیوں مانگوں میرا کوئی حق تو نہیں۔ تو وہ حالت جو رسول کریم ﷺ کی تھی اور وہ بے بسی کی کیفیت جو اس امر سے ظاہر ہوتی ہے کہ رسول کریم ﷺ الگ ایک گوشے میں کھڑے رہتے اور اگر کچھ کھانے کو ملتا تو لے لیتے۔ نہیں تو زبان سے کچھ نہ کہتے۔ ہماری بچیوں کی حالت اس سے بدرجہا بہتر رہی۔ مگر پھر رسول کریم ﷺ کی حالت بھی بدل گئی اور اس میں اتنا زبردست اور عظیم الشان تغیر آگیا کہ آپ ہی دنیا کے مالک بن گئے اور تمام جہان آپ کے قدموں میں گر گیا۔ اسی طرح ان بچیوں اور ان سے تعلق رکھنے والوں کے بھی اختیار میں ہے کہ وہ اگر چاہیں تو ترقی کر سکتے ہیں اور بہت زیادہ عزت اور عظمت حاصل کر سکتے ہیں اگر وہ خدا تعالیٰ کے ہو جائیں تو ان کو بھی عزت مل سکتی ہے اور ان کے غم اور دکھ بھی خوشی سے بدل سکتے ہیں۔ باقی رہی مرنے والوں کی جدائی سو یہ تو ایک عارضی جدائی ہے۔ چنانچہ موت کی خبر سن کر اسلام نے زبان سے جو کلمہ کہنے کا ارشاد فرمایا ہے وہی اس قدر امید افزا ہے کہ اس کو زبان سے نکالنے کے بعد کوئی کلفت باقی نہیں رہتی۔ اسلام کہتا ہے جب کسی کی موت کی خبر سنو تو تم کہو اِنَّا لِلّٰہِ وَاِنَّآ اِلَیْہِ رَاجِعُوْنَ۔ [۱۲] یعنی اے مرنے والے ہم اللہ کے ہیں اور جہاں تم جارہے ہو وہیں ایک دن ہم بھی آرہیں گے۔ دنیا کی جدائیوں میں بے شک تکلیف ہو سکتی ہے۔ مگر اس آخری جدائی میں جو موت کی جدائی ہے اگر انسان ایمان پر قائم ہو تو کوئی زیادہ تکلیف نہیں ہو سکتی۔ کیونکہ اِنَّا لِلّٰہِ وَاِنَّآ اِلَیْہِ رَاجِعُوْنَ میں اللہ تعالیٰ نے ملاقات کا وعدہ دیا ہوا ہے۔ ضرورت اس امر کی ہے کہ انسان خدا تعالیٰ کے وعدوں اور اس کی باتوں کی عظمت کو سمجھتا ہو۔ خدا تعالیٰ کی طرف سے ایک ہوا چل رہی ہے جو شخص خدا تعالیٰ کی اس چلائی ہوئی ہوا کے موافق چلتا ہے وہ سرعت کے ساتھ آگے کی طرف بڑھتا چلا جاتا ہے مگر وہ جو خدا تعالیٰ کی چلائی ہوئی ہوا کے مخالف چلتا ہے وہ گرتا ہے اور پھر سنبھلتا ہے پھر گرتا ہے اور پھر سنبھلتا ہے یہاں تک کہ آخری دفعہ ایسا گرتا ہے کہ ہمیشہ کے لئے گر جاتا ہے۔ (الفضل ۳۔ مئی ۱۹۶۱ء صفحہ ۲ تا ۷)

۱؎ الفضل ۱۳- مئی ۱۹۳۹ء صفحہ ۱
۲؎ سیرت حلبیہ جلد ۱ صفحہ ۱۳۵ مطبوعہ مصر ۱۹۳۵ء
۳؎ سیرت حلبیہ جلد ۳ صفحہ ۱۱۳ مطبوعہ مصر ۱۹۳۵ء
زاد المعاد جلد ۱ صفحہ ۴۲۴ مؤلفہ ابن قیم مطبوعہ مصر
۴؎ بخاری کتاب التفسیر تفسیر آیت "تَبَّتْ یَدَآ اَبِیْ لَھَبٍ"
۵؎
۶؎ بخاری کتاب المناقب باب فضل ابی بکر بعد النبی ﷺ
۷؎ سیرت عمر بن الخطاب (عربی) لابن الجوزی صفحہ ۸۵، ۸۷ مطبوعہ مصر۔
۸؎ آئینہ کمالات اسلام صفحہ ۵۹۶ روحانی خزائن جلد نمبر ۵
۹؎ تاریخ احمدیت جلد ۸ صفحہ ۶۲۱۔
۱۰؎ نیز یہ بھی فرمایا کہ آتھم مرزا صاحب کی دعا سے مرا ہے۔
(اشاراتِ فریدی صفحہ ۱۳، ۱۴ مطبوعہ مطبع مفید عام آگرہ ۱۳۲۰ھ)
۱۱؎
۱۲؎ البقرۃ : ۱۵۷